آزاد کشمیر کی دینی وروحانی شخصیات: سوانح نگاری کی روایت کا تجزیہ

Religious and Spiritual Personalities of Azad Kashmir: An Analysis of the Biographical Tradition

محمد دین

لیکچرار، شعبہ اُردو، گورنمنٹ اسلامیہ پوسٹ گریجویٹ کالج، قصور

Abstract:

The tradition of biographical writing in Azad Kashmir, particularly with reference to the lives and services of Ulama and Sufi saints, holds a significant literary and intellectual dimension. The presence of religious and spiritual centers in this region, along with the contributions of Sufi saints and Ulama, deeply influenced the socio-cultural and intellectual fabric of Kashmiri society. In order to preserve their legacy, different scholars and writers have, from time to time, produced short booklets, essays, and journal articles that record their lives and achievements. Although these works do not fully conform to the established principles of biography as a literary genre, they nevertheless provide essential details and valuable insights into the personalities being discussed.The quarterly journal *Anwar al-Awliya* published by the Department of Auqaf, as well as biographical booklets produced under the aegis of the Majlis-i-Tahqiq wa Tasnif, stand out as notable examples of this tradition. These writings shed light on the spiritual endeavors of Sufi saints, the scholarly struggles of Ulama, and their roles within the larger religious, political, and social movements of the Indian subcontinent.

Key words: tradition of biographical, socio-cultural, achievements, quarterly journal *Anwar al-Awliya*, Majlis-i-Tahqiq wa Tasnif, future researchers

کشمیر کا خطہ جغرافیائی تنوع کے اعتبار سے جس طرح دنیا بھر میں اپنی مثال آپ ہے، اسی طرح لسانی و ادبی تنوع کے اعتبار سے بھی ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں صدیوں سے مختلف زبانیں اور بولیاں نہ صرف بولی جاتی رہی ہیں بلکہ انھوں نے ادب و ثقافت پر گہرے اثرات بھی مرتب کیے ہیں۔ سنسکرت، ڈوگری، عربی، فارسی، اردو، کشمیری، پہاڑی، گوجری، بلتی، شینا، بروشسکی، بدرواہی اور بکروالی زبانیں اس خطے کے لسانی سرمائے کی وہ قیمتی دولت ہیں جنھوں نے کشمیر کی ادبی روایت کو وسعت اور تنوع عطا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کی ادبی فضا میں ایک ہمہ رنگی اور ہمہ گیری دکھائی دیتی ہے، جس نے نہ صرف مقامی زبانوں کو ایک دوسرے سے جوڑا بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اس خطے کی ادبی شناخت کو مستحکم کیا۔ ان زبانوں میں عربی اور فارسی کو خاص مقام حاصل ہے۔ عربی زبان نے جہاں اسلامی تعلیمات کی روشنی کو کشمیر میں پھیلایا، وہیں فارسی زبان نے اس خطے کے علمی و ادبی شعور کو جِلا بخشی۔ فارسی صدیوں تک ریاست جموں وکشمیر کی سرکاری اور علمی زبان رہی، اس لیے اس کے اثرات یہاں کے علمی و ادبی سرمائے پر نہایت گہرے انداز میں مرتب ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان کی جڑیں اس خطے میں مضبوط ہوئیں اور اردو ادب کی تشکیل میں عربی وفارسی کا کردار ایک بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ سوانح نگاری کی روایت میں بھی ان دونوں زبانوں کے اثرات جابجا دکھائی دیتے ہیں۔ عربی کے دینی و تاریخی سرمایے نے اور فارسی کے تذکرہ و سوانحی ادب نے مل کر اردو کی اس صنف کو مضبوط اور بامقصد بنایا۔

جب مسلمان کشمیر میں برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے نہ صرف ایک مضبوط حکومت کی بنیاد رکھی بلکہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں توحید، مساوات، عدل و انصاف اور سماجی ہم آہنگی کے اصولوں کو عام کیا۔ اس کے نتیجے میں کشمیر کے معاشرے میں ایک نیا

فکری اور تہذیبی انقلاب برپا ہوا۔ عوام کی زندگی میں دینی شعور بیدار ہوا اور سماجی ترقی کے نئے امکانات روشن ہوئے۔ اس سیاسی و سماجی استحکام کے ساتھ ساتھ روحانی فضا بھی پروان چڑھی اور صوفیائے کرام و بزرگانِ دین کی آمد نے اس خطے کو ایک نئے روحانی مرکز کی حیثیت عطا کی۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کو برصغیر میں "اولیاء اللہ کا مسکن" کہا جانے لگا۔ صوفیا نے اپنے عملی رویے، روحانی تعلیمات اور اخلاقی اقدار کے ذریعے عوام کی زندگیوں میں مثبت تبدیلیاں پیدا کیں۔ ان کے ہاں انسان دوستی، مساوات، ایثار اور اخوت کے تصورات بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔ یہی تعلیمات کشمیر کے عوام کے دلوں میں اتر گئیں اور انہوں نے اپنی سماجی اور ادبی روایت کو انہی اقدار پر استوار کیا۔ کشمیر کے شعرا اور ادبا نے بھی صوفیائے کرام کی تعلیمات سے فیض حاصل کیا اور اپنی تحریروں میں ان روحانی و اخلاقی اقدار کو اجاگر کیا۔ کشمیر کا لسانی و ادبی تنوع دراصل اس خطے کے تہذیبی ارتقا کا آئینہ دار ہے۔ عربی و فارسی کے اثرات نے نہ صرف اردو ادب کو مضبوط بنیادیں فراہم کیں بلکہ سوانح نگاری جیسے اصناف کو بھی فکری گہرائی اور وسعت عطا کی۔ اسی تناظر میں کشمیر کی ادبی روایت کو دیکھا جائے تو اس کے پس منظر میں ایک ہمہ گیر تاریخی و روحانی ورثہ کارفرما دکھائی دیتا ہے جس نے اس خطے کو برصغیر کے دیگر علاقوں سے ممتاز کر دیا۔ سید محمود آزاد اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "کشمیر کی وادی کو اولیا اللہ کا مسکن کہا گیا اور حق بات یہ کہ تیرھویں صدی عیسوی کے تاریخ کے ہر دور میں اس روح پرور وادی میں ایسے باکمال بزرگان دین اور علما و مشائخ گزرے ہیں۔ جن کے دینی اور روحانی کارنامے آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں اور جن کے ذکر کے بغیر کشمیر کی تاریخ نامکمل رہتی ہے"(۱)

صوفیائے کرام کی آمد نے وادئ کشمیر کی روحانی فضا کو ایک نئی سمت عطا کی۔ ان کی تعلیمات اور عملی زندگی نے کشمیری عوام کی سیاسی، سماجی، اخلاقی اور مذہبی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ صوفیائے کرام نے محبت، رواداری، اخوت اور انسان دوستی کے وہ اصول عام کیے جنہوں نے کشمیری عوام کو ایک دوسرے کے ساتھ محبت، عقیدت اور احترام کے اٹوٹ رشتے میں باندھ دیا۔ ان کی خانقاہیں اور مجالس نہ صرف دینی و روحانی تربیت کا مرکز بنیں بلکہ عوامی زندگی میں اصلاح اور سماجی ہم آہنگی کا ذریعہ بھی ثابت ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیا کی شخصیتیں عوامی عقیدت کا محور بن گئیں اور ان کے افکار و اعمال کو آنے والی نسلوں تک پہنچانے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ اسی مقصد کے تحت اہلِ قلم اور اہلِ دل حضرات نے صوفیائے کرام کی حیات و خدمات کو محفوظ کرنے کے لیے قلم اٹھایا۔ یوں کشمیر میں سوانح نگاری کی ایک مضبوط روایت نے جنم لیا۔ ابتدا میں یہ روایت فارسی زبان میں پروان چڑھی کیونکہ اس دور میں فارسی علمی اور ادبی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس سلسلے میں چند نہایت اہم تصانیف سامنے آئیں جنہوں نے بعد کی ادبی روایت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان میں علی بابا دینہ کی **"تذکرۃ العارفین"**، بابا نصیب الدین غازی کی **"نورنامہ"** اور حاجی عبد الوہاب کی **"فتوحات الکبریٰ"** شامل ہیں۔ ان تصانیف میں صوفیا کے حالاتِ زندگی، روحانی مقامات، ملفوظات اور کرامات کو نہایت محبت اور عقیدت کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔ یہ کتب صرف تاریخی ریکارڈ نہیں بلکہ کشمیری عوام کے روحانی و تہذیبی شعور کا عکس بھی ہیں۔

فارسی دور کے بعد جب اردو نے ریاست جموں و کشمیر میں قدم جمانے شروع کیے تو سوانحی ادب بھی اردو میں منتقل ہوا اور نئی جہتوں کے ساتھ فروغ پانے لگا۔ اردو زبان میں صوفیا اور مشائخ کی حیات پر متعدد اہم تصانیف سامنے آئیں جو آج بھی تحقیقی و تاریخی لحاظ سے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں غلام احمد مہجور کی **"حیاتِ رحیم"**، مفتی محمد شاہ کی **"مقدس زندگی"**، **"مناسکِ سادات"**،

"فتوحاتِ ربانی "اور **"حیاتِ عرفی "** شامل ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک اور اہم کڑی محمد دین فوق کی مشہور تصنیف **"تذکرۃ الصالحین "** ہے جس میں بزرگوں کے حالات کو نہایت تفصیل اور مستند انداز میں محفوظ کیا گیا۔ ان کتب کی اہمیت اس لحاظ سے بھی زیادہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف صوفیائے کرام کی حیات کو قلم بند کیا بلکہ کشمیری معاشرت، ثقافت اور مذہبی رویوں کی عکاسی بھی کی۔

تقسیم برصغیر کے بعد ریاست جموں وکشمیر کا جو علاقہ "آزاد ریاست جموں وکشمیر" کہلایا کی ادبی روایت سابقہ ریاست جموں و کشمیر کا ہی تسلسل ہے۔ آزادی کے بعد خطے میں متعدد ایسی تصانیف منظر عام پر آئیں جو بزرگان دین کے حالات و واقعات پر مبنی ہیں اور سوانح نگاری کے نقش اول کی صورت کے طور پر انھیں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان تصانیف میں "حیات امیر شریعت مولانا عبد اللہ کفل گڑھی "از قاضی بشیر احمد، فیض الغنی، از پروفیسر یعقوب شائق "سوانح حیات مولانا ثنا اللہ شاہ "از عطا اللہ شاہ حضرت پیر سید علی ہمدانی ڈاکٹر محمد ریاض "شاہ ہمدان "مرتبہ جواد جعفری "حیات پیر شاہ غازی "مرتبہ سید محمود آزاد، "حیات حضرت جنید شاہ "مرتبہ سید محمود آزاد، "حیات حضرت غازی قلندر "، "حضرت شاہ عنایت اللہ ولی "، "حیات حضرت سہیلی سرکار "حیات سائیں، "حیات حضرت محمد علی "مرتبہ سید محمود آزاد، "فیضان سید علی "مرتبہ شبیر احمد شاہ اور تذکرہ صوفیائے کشمیر از ڈاکٹر سید محمد یوسف بخاری قابل ذکر ہیں۔

حیات امیر شریعت حضرت مولانا عبد اللہ کفل گڑھوی:

حضرت مولانا عبد اللہ کفل گڑھوی فاضل دیوبند کو خطہ پونچھ کی نامور مذہبی شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ڈوگرہ عہد حکومت میں ریاست پونچھ کے مسلمانوں کے ملی و سیاسی حقوق کے حصول کے لیے ان کی خدمات گراں قدر ہیں۔ قاضی بشیر احمد نے "حیات امیر شریعت" میں مولانا عبد اللہ کفل گڑھوی کے حالاتِ زندگی، حصول تعلیم اور خطہ پونچھ میں ان کی سیاسی، دینی خدمات کا احاطہ کیا ہے۔ امیر شریعت مولانا عبد اللہ کفل گڑھوی کے متعلق قاضی بشیر احمد لکھتے ہیں:

> "امیر شریعت مولانا عبد اللہ ریاست پونچھ کے نڈر اور بے باک رہنما تھے۔ ظلم و جبر کے سیاہ ترین دور میں انہوں نے پونچھ کے مسلمانوں کو اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کا حوصلہ دیا۔ یوں تو اس دور میں مسلمانوں کے اور بھی کئی رہنما تھے لیکن مولانا کی آواز سب سے زیادہ وزنی تھی یہی وجہ ہے کہ پونچھ کے عوام نے قبیلائی اور عصبیتوں سے بالاتر ہو کر آپ کی لیڈر شپ کو قبول کیا اور آپ نے جب بھی حکومت کی زیادتیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو پونچھ کے کونے کونے سے لوگ حمایت میں کھڑے ہوئے تھے"(۲)

مولانا عبد اللہ کی حیات و خدمات کو موضوع بنانے والی اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے صاحبِ سوانح کے حالاتِ زندگی کو براہِ راست بیان کرنے کے بجائے سب سے پہلے اُن کے عہد کے سیاسی و تاریخی پس منظر کو نہایت باریک بینی کے ساتھ واضح کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے برصغیر کے بدلتے ہوئے حالات، اہم سیاسی تحاریک اور ان کے اثرات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو محض ایک فوجی بغاوت یا حادثہ قرار دینے کے بجائے اسے برصغیر کی سیاسی بیداری اور قومی شعور کی بنیاد کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ اس کے بعد تحریکِ ریشمی رومال اور تحریکِ خلافت جیسے بڑے عوامی و دینی تحرکات کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے برصغیر کے مسلمانوں میں آزادی کی تڑپ اور اتحاد و اتفاق کا جذبہ پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی طرح تحریکِ بالاکوٹ کو بھی اس تناظر میں پیش کیا گیا ہے کہ یہ کس طرح کشمیری عوام اور علما میں مزاحمتی شعور کو زندہ رکھنے کا

سبب بنی۔ تحریکِ کشمیر اور تحریکِ پاکستان پر بھی مصنف نے روشنی ڈالی ہے اور ان تحاریک کے اثرات کو مولانا عبد اللہ کی فکر و عمل کے ساتھ جوڑنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

کتاب کا سب سے اہم اور بنیادی حصہ باب دوم ہے جس میں مصنف قاضی بشیر احمد نے مولانا عبد اللہ کی سیاسی و ملی خدمات کو نہایت جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ اس باب میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ مولانا عبد اللہ محض ایک مذہبی راہنما یا صوفی بزرگ نہیں تھے بلکہ اُنہوں نے اپنے عہد کے سیاسی و قومی مسائل میں بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ ان کی خدمات کو تحریکِ آزادی کشمیر اور تحریکِ پاکستان دونوں کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ مصنف نے دستاویزی شہادتوں، بیانات اور تاریخی حوالہ جات کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا عبد اللہ نے اپنی بصیرت، جرات اور قیادت کے ذریعے عوامی شعور کی آبیاری کی اور انہیں سیاسی و دینی تحریکات کے ساتھ وابستہ رکھا۔ کتاب کے اختتام پر مصنف نے مختلف سیاسی و مذہبی شخصیات کے تاثرات بھی شامل کیے ہیں تاکہ مولانا عبد اللہ کی شخصیت اور خدمات کا ایک جامع اور کثیر الجہتی خاکہ قاری کے سامنے آسکے۔ ان تاثرات میں برصغیر اور بالخصوص ریاست جموں و کشمیر کی نامور شخصیات کی آراء شامل ہیں، جن میں شیخ الحدیث حضرت مولانا یوسف پلندری، سردار محمد ابراہیم خان (بانی آزاد کشمیر)، سردار محمد عبد القیوم خان، سردار فتح محمد کریلوی، سید ثناء اللہ شاہ اور سردار محمد الطاف سالک جیسے معروف نام شامل ہیں۔ ان حضرات نے نہ صرف مولانا عبد اللہ کی سیاسی بصیرت اور ملی خدمات کو سراہا بلکہ اُن کی علمی و روحانی قیادت کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا۔ یہ تاثرات اس بات کا ثبوت ہیں کہ مولانا عبد اللہ کی شخصیت اپنے دور کے سیاسی و مذہبی حلقوں میں کس قدر اثر انگیز اور معتبر تھی۔ مولانا عبد الہادی صاحب سوانح کی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مولانا مرحوم ہر صفت سے یکتائے زمانہ و ممتاز حیثیت رکھتے تھے علمائے کرام میں ایسا مولوی کوئی نہیں دیکھا۔ اگر مولانا کو فخر اسلام کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا" (۳)

مولانا محمد عبد اللہ مرحوم کفل گڑھوی ایک ایسی شخصیت تھے جنہوں نے اپنی پوری زندگی ملک اور ملت کے لیے وابستہ کر دی ہے۔ انہوں نے قومی و ملی حوالے سے جو خدمات سرانجام دیں انہیں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

فیض الغنی:

مولانا عبد الغنیؒ کا شمار دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے والے علماءمیں سے تھے۔ دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب وہ واپس اپنے آبائی علاقہ غنی آباد (جھڑ) ضلع باغ آئے تو اس دور میں ہندوؤں اور سکھوں کے میل جول کے باعث مسلمانوں میں بعض ایسی رسوم فروغ پاچکی تھیں جو دین اسلام کے صریحاً منافی تھیں۔ جعلی فقیروں اور پیروں کی آؤ بھگت، ہر جمعرات کو کھانا پکار کر رکھنا کہ روحیں گھروں کو لوٹتی ہیں، کالے مرغ اور کالے بکرے کا صدقہ کرنا، شادی میں لڑکی والوں کا لڑکے والوں سے روپے پیسے لینا، جیسے مقامی اصطلاح میں رَم کہا جاتا تھا اور پھر ابھی میت کی تدفین نہیں ہوتی تھی کہ گھر والوں کو کھانا پکا کر دیا جاتا تھا۔ یہ اور ان جیسی کئی اور بدعات معاشرے کا لازمی جزو بن چکی تھیں۔ تعلیم نہ ہونے کے باعث دین اسلام سے تعلق واجبی سا تھا۔

مولانا عبد اللہ نے اپنے دور میں دینی اور سماجی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور سب سے پہلے اپنی دعوتی و اصلاحی سرگرمیوں کا آغاز اپنے گاؤں جھڑ (غنی آباد) سے کیا۔ اس وقت معاشرے میں کئی ایسی غیر شرعی رسومات اور بدعات رائج تھیں جو دین اسلام کی اصل تعلیمات کے خلاف تھیں۔ مولانا نے نہ صرف ان رسوم کی نشاندہی کی بلکہ عملی جدوجہد کے ذریعے ان کے خاتمے کی کامیاب کوشش کی۔ دین اسلام کی صحیح روح کو عام کرنے اور عوام کو قرآن و سنت کی روشنی میں زندگی گزارنے کا شعور دینے کے لیے انہوں نے سب

سے پہلے اپنے گاؤں اور بعد ازاں قریبی علاقے "بیس بگلہ" میں ایک مسجد قائم کی۔ اُس وقت بیس بگلہ جنگل کی شکل میں ویران سا علاقہ تھا لیکن مولانا نے اسی جگہ پر مسجد اور ساتھ ہی "مدرسہ انجمن فیض القرآن" کی بنیاد رکھی۔ یہ مدرسہ نہ صرف تعلیم و تعلم کا مرکز بنا بلکہ اصلاحِ معاشرہ اور دینی بیداری کی ایک تحریک کا نقطہ آغاز بھی ثابت ہوا۔ مدرسے کے قیام کے بعد مولانا نے دینی سرگرمیوں کو مزید منظم کرنے کے لیے سالانہ دینی جلسوں کا آغاز کیا، جو آج بھی تسلسل کے ساتھ منعقد کیے جا رہے ہیں۔ ان جلسوں میں پاکستان اور آزاد کشمیر کے دور دراز علاقوں سے ممتاز علمائے کرام کو دعوت دی جاتی، جو عوام کو اصلاحی اور تعلیمی خطابات کے ذریعے دین کی اصل روح سے روشناس کرواتے۔ ان مجالس کے ذریعے نہ صرف لوگوں کے ذہنوں سے غیر اسلامی رسومات کا اثر ختم ہوا بلکہ دینی شعور اور اسلامی اقدار کی جڑیں مزید مضبوط ہو گئیں۔

مدرسہ انجمن فیض القرآن بیس بگلہ نے قلیل مدت ہی میں دینی تعلیم کا ایک ایسا مرکز کی حیثیت اختیار کر لی جس سے فارغ التحصیل طلبہ نے مختلف علاقوں میں جا کر دین کی شمع کو روشن کیا۔ ان طلبہ نے نہ صرف مساجد و مدارس کی بنیاد رکھی بلکہ عوام الناس میں دین اسلام کی تعلیمات کو عام کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح مولانا کی یہ کاوشیں محض ایک گاؤں یا علاقے تک محدود نہ رہیں بلکہ ان کے اثرات وسیع تر علاقے میں مرتب ہوئے اور یہ ادارہ اصلاحِ معاشرہ، مذہبی بیداری اور اسلامی اقدار کے فروغ کا ایک مستقل ذریعہ بن گیا۔ مولانا سید ظفر حسین ندوی سابق ڈائریکٹر امور دینیہ آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر مولانا عبد الغنی کے ان اقدامات کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

> "صاحب سوانح حضرت مولانا عبد الغنیؒ سے میرا تعلق ۱۹۴۳ء سے ان کی وفات ۱۹۶۶ء تک پورے (۲۳) برسوں پر محیط ہے۔ ۱۹۴۷ کے جہادِ آزادی میں ہم نے مل کر کام کیا۔ ان کی حیات میں بھی اور ان کے بعد بھی ان کے قائم کردہ "مدرسہ فیض القرآن" کے سالانہ اجتماعات میں حاضری کا موقع ملتا رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مولانا عبد الغنی مرحوم خدا ترسی، اخلاص، تقویٰ، علم و فضل اور زہد و ورع کے اعتبار سے اسلاف کی سیرت کا دلکش نمونہ تھے۔ وہ وجہ اللہ دوسروں سے تعلق استوار کرتے اور جو شخص ایک مرتبہ ان کے قریب آجاتا وہ ان کا گرویدہ بن جاتا۔ انہوں نے ایک دور افتادہ جنگل پر دینی درسگاہ کی بنیاد رکھی جہاں باہر سے کسی فرد کا پہنچنا دشوار تھا۔ اس زمانہ میں ذرائع آمد و رفت نہیں تھے اور نہ آج کی طرح پختہ سڑک موجود تھی لیکنیہ صرف مولانا کا اخلاص تھا جو آزاد کشمیر اور پاکستان کے بڑے بڑے علمائے کرام کو اس پہاڑی پر کھینچلاتا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے بیس بگلہ کی "جامع مسجد" اور "مدرسہ فیض القرآن" کی عمارت تعمیر ہوئی اور پھر چند سالوں میں وہ بڑی دینی درسگاہ بن گئی"(۴)

مولانا عبد الغنی کے ایک شاگردِ رشید پروفیسر یعقوب شائق نے مولانا کی انہی دینی خدمات کے حوالے سے "فیض الغنی" کے نام سے ان کی سوانح حیات کو مرتب کیا ہے اور ان کارناموں کو بھی بیان کیا ہے جو مولانا عبد الغنیؒ مرحوم نے اس خطہ میں سر انجام دیے۔ مؤلف نے اپنی تصنیف کے آغاز میں "دارارقم" سے لے کر دارالعلوم دیوبند تک اسلامی دنیا کے نظام تعلیم پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں ان نامور کشمیری علماء کا بھی ذکر کیا ہے جو دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے۔ ان علما میں مولانا محمد انور شاہ کاشمیری، مولانا علم دین کفل گڑھوی، مولانا میر واعظ سید محمد یوسف شاہ، مولانا محمد شریف خان، مولانا غلام حیدر پھلیاں والے، مولانا عبد الرحمان

ٹاٹوی، مولانا خلیل احمد ٹاٹوی، مولانا عبد اللہ سیاکھوی، مولانا عبد اللہ بھمبروی اور مولانا عبد القدوس شامل ہیں۔ مولانا عبد الغنی کی شخصیت کے بارے میں پروفیسر یعقوب شائق لکھتے ہیں:

"دیکھنے میں ایک عام انسان لیکن پاس بیٹھے تو اایک ایسے غیر معمولی انسان سے سابقہ پڑے جس کے قرب میں روح کو بالیدگی حاصل ہو۔ جسے دیکھ کر خدا یاد آجائے۔ جس کی مجلس میں زندگی امید اور استقامت کا دامن تھام لے اور خزاں زدہ دلوں پر بہار کی چاندنی لوٹ آئے اور جس کی محفل میں روح کی پہنائیاں، ایماں ویقین کی ٹھنڈک محسوس کریں۔ مزاج میں انکساری، خودداری اور دنیا والوں سے بے نیازی کا ایک حسین و جمیل امتزاج..... گفتگو میں بلا کا سوز اور حرارت کہ جس سے پتھر پگھل جائیں۔ طبیعت میں سادگی، مسائل کے تجزیہ میں منطقی استدلال، افراط و تفریط سے گریز، معاملات میں کھرا پن، قلب وزبان اور فکر و عمل میں مکمل ہم آہنگی۔"(۵)

مولانا کی دین اسلام سے وابستگی اپنی انتہا درجے پر تھی۔ ان کییہ وابستگی مصنف کے مطابق:

"ان کی شخصیت میں شرافت اور وضع داری کے ساتھ ایک خاص قسم کا رعب وجلال بھی تھا۔ ان کی مجلس میں کسی چھوٹے یا بڑے کو یہ جرأت نہ ہوتی کہ گفتگو کرتے ہوئے کسی ناشائستہ بات یا ابتذال پر اتر آئے۔ خلاف شریعت بات پر انہیں اشتعال آجاتا اور سخت گرفت فرماتے۔ ایسے مواقع پر وہ کسیمداہنت یا مصلحت کو گوارا نہیں فرماتے تھے۔ جو بات کہنا ہوتی علی الاعلان کہتے۔ پیٹھ پیچھے باتیں کرنے سے شدید نفرت تھی۔"(۶)

کشمیر میں آنے سے قبل ہی مولانا نے اپنے اہداف کا تعین کر لیا تھا۔ چنانچہ کشمیر آمد کے فوراً بعد ہی انہوں نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ ان کی دینی خدمات کے سلسلے میں مؤلف بیان کرتے ہیں:

"جملہ افراد کی شہادت یہ ہے کہ دیوبند سے تشریف آوری کے فوری بعد آپ نے سب سے پہلے گاؤں کے بااثر اور معتبر افراد کا اجلاس طلب کیا اور ان کے سامنے کام کا پورا نقشہ کار رکھا۔ یہ اہداف حسب ذیل تھے۔

اولاً: عوام الناس کو ایمان و یقین کے تقاضوں سے روشناس کرنا اور انہیں ارکان اسلام کی ادائیگی کے لیے دعوت دینا۔

ثانیاً: بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے ایک تعلیمی ادارے کا قیام

ثالثاً: شرک وبدعت اور غیر اسلامی رسوم ورواج کی اصلاح کے لیے باضابطہ تحریک کا قیام

رابعا: جہاد کشمیر کی تیاری اور وسائل کی فراہمی۔"(۷)

پروفیسر یعقوب شائق کی یہ تصنیف اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہ صرف ایک سوانحی دستاویز ہے بلکہ کشمیر کی دینی، سیاسی اور سماجی تاریخ پر بھی ایک معتبر ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے مولانا عبد اللہ کی شخصیت اور ان کی خدمات کے مختلف پہلوؤں کو جس محققانہ انداز میں پیش کیا ہے، وہ ایک طرف مولانا کی ہمہ جہت شخصیت کا عکاس ہے تو دوسری طرف قاری کو اس عہد کے تاریخی پس منظر سے بھی روشناس کراتا ہے۔ مولانا کی جدوجہد کو محض ایک فرد کی کوشش سمجھنا ان کی خدمات کے ساتھ ناانصافی ہوگی، کیونکہ ان کی ذات کے ساتھ پورا ایک عہد وابستہ ہے جس میں دینی بیداری، سماجی اصلاح اور سیاسی شعور سب نمایاں نظر

آتے ہیں۔ کتاب میں سب سے پہلے مولانا کی قیادت میں قائم کیے جانے والے مدارس اور مساجد کا ذکر نہایت تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ان اداروں کی بنیاد دراصل ایک ایسے وقت میں رکھی گئی جب علاقے میں علم دین اور اصلاحِ معاشرہ کی شدید ضرورت تھی۔ مولانا نے ان مدارس کو محض تدریسی مراکز نہیں بنایا بلکہ انہیں دین کی تبلیغ، اخلاقی تربیت اور سماجی اصلاح کے فعال مراکز کے طور پر استوار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان اداروں سے فارغ التحصیل طلبہ بعد میں نہ صرف کشمیر بلکہ پاکستان کے مختلف خطوں میں جا کر دین اسلام کی روشنی پھیلانے کا سبب بنے۔

پروفیسر یعقوب شائق نے ۱۹۴۷ء کے جہادِ آزادی کشمیر میں مولانا عبد اللہ کے کردار کو خصوصی طور پر اجاگر کیا ہے۔ اس جہاد میں مولانا نے نہ صرف عوام کو منظم کیا بلکہ ان کے حوصلے بلند کیے اور ان میں ایک نئے جذبے کی لہر دوڑا دی۔ ان کا کردار قیادت اور رہنمائی تک محدود نہ تھا بلکہ وہ عملی طور پر بھی میدان میں شریک رہے۔ ان کی موجودگی نے نوجوانوں میں جرات و شجاعت پیدا کی اور انہیں مقصد کے حصول کے لیے ہر قربانی دینے پر آمادہ کیا۔ مولانا کی یہی جہادی اور ملی خدمات انہیں صرف ایک عالمِ دین ہی نہیں بلکہ ایک عظیم رہبر اور مجاہد کے طور پر بھی نمایاں کرتی ہیں۔

اسی سلسلے میں پروفیسر شائق نے مولانا کی بطور امیر بیت المال تقرری کو بھی بیان کیا ہے۔ یہ منصب نہایت اہمیت کا حامل تھا، کیونکہ جہاد اور دینی سرگرمیوں کے لیے مالی وسائل کی فراہمی اور ان کا شفاف استعمال ایک بڑی ذمہ داری تھی۔ مولانا نے یہ ذمہ داری نہایت دیانت داری اور امانت داری کے ساتھ نبھائی۔ ان کے فیصلے اور اقدامات اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ مالی امور میں بھی کسی قسم کی کوتاہی یا بے احتیاطی کے قائل نہ تھے۔ ان کے دور میں بیت المال کے نظام نے عوام میں اعتماد پیدا کیا اور اس اعتماد نے جہادی اور دینی سرگرمیوں کو مزید تقویت بخشی۔ کتاب میں مولانا کی بحیثیت عربی مدرس تقرری کا بھی تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ امر اس بات کا بین ثبوت ہے کہ مولانا صرف ایک عملی جدوجہد کرنے والے رہنما ہی نہیں بلکہ علمی دنیا میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ انھوں نے عربی زبان و ادب کے تدریس کے ذریعے دینی علوم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ طلبہ کی ذہنی اور علمی تربیت میں ان کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ انہوں نے نصاب کی تدریس کو محض الفاظ کی تعلیم تک محدود نہیں رکھا بلکہ اخلاقی و روحانی تربیت کو بھی اس کا لازمی جزو بنایا، جو ایک کامیاب مدرس کی اصل پہچان ہے۔ کتاب فیض الغنی کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ان اکتالیس شخصیات کا ذکر شامل ہے جو مختلف مواقع پر مولانا کے شانہ بشانہ رہیں یا براہِ راست ان سے مستفید ہوئیں۔ پروفیسر یعقوب شائق نے ان شخصیات کے تاثرات بھی کتاب کا حصہ بنایا ہے، جس سے مولانا کی شخصیت کے مختلف پہلو اور ان کی خدمات کے اثرات مزید نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ ان تاثرات میں اخلاص، عقیدت اور حقیقت پسندی جھلکتی ہے، جو مولانا کے ہم عصروں اور شاگردوں کے دلوں میں ان کی عظمت کو ظاہر کرتی ہے۔

ان شخصیات میں سیاسی رہنما بھی شامل ہیں اور دینی علماء بھی۔ سردار محمد عبد القیوم خان، جو بعد ازاں آزاد کشمیر کے صدر اور وزیرِ اعظم کے عہدے پر فائز ہوئے، نے مولانا کے کردار کو ایک رہنما اور رہبر کی حیثیت سے سراہا۔ اسی طرح میجر (ر) محمد ایوب خان، سابق اسپیکر آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی، نے بھی مولانا کی قربانیوں اور خدمات کو ناقابلِ فراموش قرار دیا۔ دینی رہنماؤں میں مولانا محمد یوسف خان (شیخ الحدیث دار العلوم پلندری)، عبد الرشید ترابی (امیر جماعت اسلامی آزاد کشمیر)، مولانا عبد العزیز تھوراڑوی، مولانا امیر الزمان، مولانا محمد الیاس خان، مولانا ابو عمار زاہد الراشدی، مولانا قاضی بشیر احمد (ڈسٹرکٹ قاضی راولا کوٹ) اور مولانا

پروفیسر محمد الطاف خان کے نام خصوصی طور پر شامل ہیں۔ ان سب نے مولانا کو ایک مخلص قائد، بہترین معلم اور بے مثال مجاہد قرار دیا ہے۔

یوں پروفیسر یعقوب شائق کی یہ تصنیف محض ایک فرد کی سوانح نہیں بلکہ ایک ایسے دور کی عکاس ہے جس میں مذہب، سیاست اور سماج تینوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ مولانا عبد اللہ کی خدمات ان تینوں شعبوں میں یکساں طور پر پھیلی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی حیات اور کارنامے آج بھی نہ صرف ایک تاریخی حوالہ ہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بیس بگلہ میں مولانا کو مسجد و مدرسہ کی تعمیر کے دوران جن لوگوں کی معاونت حاصل رہی ان کے حالات و واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ان لوگوں میں علمائے کرام کے علاوہ سماجی شخصیات کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ ان لوگوں میں سردار منشی ہدایت اللہ خان، راجہ سلیمان خان، حاجی شیر احمد خان اور صوبیدار (ر) علی اکبر نمایاں ہیں۔ "مردِ درویش" حضرت مولانا سید ثناء اللہ شاہ کی سوانح حیات ہے۔ جسے ان کے بیٹے سید عطاء اللہ شاہ نے مرتب کیا ہے۔ سوانح کے آغاز میں مؤلف نے خاندانی پس منظر و تعارف کے علاوہ دارالعلوم کا تعارف اور علمائے دیوبند کے عقائد و نظریات کا بھی ذکر کیا ہے۔

مولانا سید ثناء اللہ شاہ بھی دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل تھے۔ اسی ادارہ کے اثرات کے تحت آپ نے نہ صرف باغ شہر کی مرکزی مسجد میں امامت کے فرائض سنبھالے بلکہ بعد ازاں ایک مدرسہ "مدرسہ عربیہ نصرت الاسلام" کا آغاز کیا۔ مسلمانوں کو دینی علوم سے بہرور کرنے کے ساتھ ساتھ باغ شہر میں امن و امان اور بھائی چارے کی فضا کو قائم کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا اور یوں لوگوں کے دلوں میں انھوں نے انمنٹ نقوش چھوڑے۔ مصنف نے مولانا سید ثناء اللہ شاہ کے بارے میں مختلف شخصیات کے تاثرات، انٹرویوز، تعزیتی خطابات اور خطوط کو بھی اپنی تالیف کا حصہ بنایا ہے۔ نمایاں اور ممتاز شخصیات میں شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف صاحب دارالعلوم پلندری، سردار محمد عبد القیوم خان، عبد الرشید ترابی، سردار قمر زمان خان، مولانا مفتی رفیع عثمانی مہتمم جامعہ دارالعلوم کراچی اور ابو عمار علامہ زاہد الراشدی شیخ الحدیث جامعہ نصرت العلوم گوجرانوالہ شامل ہیں۔ مولانا مفتی رفیع الدین عثمانی صاحب سوانح کی وفات پر اپنی تعزیتی خط میں اپنے تاثرات کا یوں اظہار کیا ہے:

> "اب ایسے حضرات بھی ایک ایک کر کے رخصت ہوتے چلے جا رہے ہیں جنہوں نے بزرگان دین دیو بند سے براہ راست استفادہ کیا تھا۔ ایسے حضرات کا رخصت ہو جانا ہم سب کے لیے باعث تشویش بھی ہے اور صبر آزما بھی۔" (۸)

ابو عمار زاہد الراشدی کے مطابق:

> "وہ آزاد کشمیر کے ان بزرگ علمائے کرام میں سے تھے جو آج کے دور میں اپنے عظیم اسلاف اور اکابر کی یادگار اور ان کی روایات کے امین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پرانے بزرگوں کے واقعات اور طرز زندگی کے بارے میں کتابوں میں جو کچھ پڑھتے رہتے ہیں اس کی جھلک حضرت شاہ صاحبؒ کی زندگی میں بھی نظر آتی تھی اور سچی بات یہ کہ حضرت شاہ صاحبؒ ان چند گنے چنے بزرگوں میں سے تھے جنہیں دیکھ کر پرانے بزرگوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔" (۹)

میر سید علی ہمدانی کی شخصیت، ابتدائی حالات و واقعات کشمیر میں ان کی آمد اور تبلیغ کے بارے میں "حضرت میر سید علی ہمدانی" کے نام سے ڈاکٹر محمد ریاض کی ایک مختصر سی سوانح حیات ہے۔ اس تصنیف میں انھوں نے سید علی ہمدانی کی کشمیر کی طرف ہجرت اور ان کی دینی سرگرمیوں کو بیان کیا ہے:

> "شاہ ہمدان نے ۷۷۴ھ میں کشمیر کی طرف ہجرت فرمائی۔ اس کے بعد ۱۲ سال کا عرصہ آپ نے وادی اور اس کے نواح اور بعض دور دراز علاقوں کی بامقصد سیاحت میں گزارا۔ کتاب "خلاصۃ المناقب" اور "مستورات" سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نائز دوم بزرگ بڑی تندہی سے مخلوقات خدا کی رہنمائی میں لگا رہا اور ہر طبقہ کے لوگوں سے ملتا رہا۔"(۱۰)

عبدالعزیز قریشی نے اپنی گراں قدر تصنیف **"اسرار الاولیاء"** میں اسلامی تصوف کی حقیقت اور اس کے بنیادی اصولوں کو نہایت واضح اور مدلل انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے تصوف کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے اور خصوصاً صوفیائے کرام کے چار بڑے سلسلوں قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ کے تاریخی پس منظر، فکری بنیادوں اور روحانی اثرات کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ قریشی صاحب نے ان سلسلوں کے طریقِ سلوک، تربیتی اصولوں، اور عوام و خواص پر مرتب ہونے والے اثرات کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری نہ صرف تصوف کی روح سے آشنا ہوتا ہے بلکہ برصغیر میں اس کے اثر و نفوذ کو بھی بہتر طور پر سمجھنے لگتا ہے۔ کتاب میں برصغیر کی سرزمین پر صوفیائے کرام کی آمد اور ان کی دینی و سماجی خدمات کا بھی ایک جامع تذکرہ موجود ہے۔ اس ضمن میں عبدالعزیز قریشی نے اُن عظیم مشاہیر تصوف کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اس خطے میں اسلام کی اشاعت اور روحانی تربیت کے ذریعے نہ صرف دین کی روشنی عام کی بلکہ مقامی آبادی کے اخلاق و کردار کو بھی ایک نئے زاویے سے منور کیا۔ ان میں حضرت شیخ اسماعیل لاہوریؒ، حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ جیسے برصغیر کے عظیم اولیاء شامل ہیں۔ قریشی صاحب نے ان اکابرین کے حالاتِ زندگی، ان کے روحانی مقامات، ان کی علمی خدمات اور عوام الناس کے دلوں پر ان کے اثرات کو نہایت محققانہ انداز میں قلم بند کیا ہے۔

کتاب کا ایک نہایت اہم حصہ ان صوفیائے کرام سے متعلق ہے جنہوں نے بالخصوص **کشمیر** کی سرزمین پر اسلام کی اشاعت میں نمایاں اور بنیادی کردار ادا کیا۔ عبدالعزیز قریشی نے واضح کیا ہے کہ کشمیر کی روحانی و دینی تاریخ صوفیائے کرام کے فیضان اور ان کی قربانیوں کے بغیر نامکمل ہے۔ ان صوفیائے کرام میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت **حضرت میر سید علی ہمدانیؒ** کی ہے، جنہیں "شاہِ ہمدان" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کشمیر میں نہ صرف اسلام کی دعوت دی بلکہ یہاں کے معاشرتی ڈھانچے، تہذیبی اقدار اور اقتصادی حالات پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ سید علی ہمدانیؒ نے کشمیر کے عوام کو اسلام کے بنیادی اصولوں سے روشناس کرایا اور اپنے خلفاء اور مریدین کے ذریعے ایک وسیع اصلاحی تحریک برپا کی۔ اسی طرح **شیخ نورالدین ولیؒ (نورالدین رشی)** کا ذکر بھی کتاب کے اس حصے میں بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ شیخ نورالدین ولیؒ، جنہیں کشمیری رشی سلسلے کا بانی کہا جاتا ہے، نے اپنی تعلیمات اور عملی زندگی کے ذریعے توحید، مساوات، انسان دوستی اور محبت کا ایسا پیغام دیا جس نے کشمیری سماج کو نئی سمت عطا کی۔ عبدالعزیز قریشی نے ان کی خانقاہی زندگی، عوامی مقبولیت اور ان کے ماننے والوں پر پڑنے والے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ شیخ نورالدین رشیؒ کی تعلیمات مقامی ثقافت کے ساتھ ہم آہنگ تھیں، جس کی بدولت اسلام نے کشمیر میں تیزی سے جڑیں پکڑیں۔ یوں عبدالعزیز قریشی کی "اسرار الاولیاء" محض ایک سوانحی یا تذکرہ نویسی پر مبنی تصنیف نہیں بلکہ برصغیر اور خصوصاً

کشمیر میں تصوف کے تاریخی، فکری اور عملی پہلوؤں کا ایک جامع مرقع ہے۔ یہ کتاب قاری کو اس بات پر قائل کرتی ہے کہ اسلامی تصوف نے نہ صرف روحانی زندگی کی تشکیل میں کردار ادا کیا بلکہ برصغیر کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی تناظر کو بھی نئی جہت عطا کی۔ یہ تالیف اصل میں کوٹلی آزاد کشمیر کی ممتاز روحانی شخصیت حضرت قاضی فتح اللہ صدیقی شاری کے بارے میں ہے۔ چنانچہ کتاب کا اہم حصہ قاضی فتح اللہ صدیقی کے حالات وواقعات اور ان کی تعلیمات کے بارے میں ہے۔

شاہ ہمدان میر سید علی ہمدانی:

میر سید علی ہمدانی کے حوالے سے ہی جواد جعفری نے کشمیر اکیڈیمی مظفر آباد سے "میر سید علی ہمدانی" کے نام سے کتاب مرتب کر کے شائع کروائی ہے۔ کتاب میں میر سید علی ہمدانی کی حیات وخدمات کے حوالے سے دو اہم مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے پہلا مضمون پروفیسر ڈاکٹر عبدالرحمان ہمدانی کا "میر سید ہمدانی ایک تاریخ ساز شخصیت" جبکہ دوسرا مضمون سید محمود آزاد کا ہے جس کا موضوع "حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی" ہے۔ جبکہ "بلتستان میں میر سید علی ہمدانی کے آثار" از فدا محمد شاد بھی تالیف کا حصہ ہے۔ فیضانِ سید علی: ۳۳۰صفحات پر مشتمل "فیضان سید علی" گاؤں سوہاوہ تحصیل دھیر کوٹ باغ کی معروف علمی وروحانی شخصیت سید سید علی کی سوانح حیات ہے جسے سید شبیر احمد شاہ نے مرتب کیا ہے۔ زیرِ تالیف میں مؤلف نے سید سید علی کے اباؤاجداد ان کی ابتدائی زندگی، تعلیمات، ان کی کرامات اور ملفوظات کا تفصیل سے محاکمہ کیا ہے.

تذکرہ صوفیائے کشمیر:

ڈاکٹر سید یوسف بخاری نے "تذکرہ صوفیائے کشمیر" میں ریاست جموں وکشمیر کے صوفیاے کرام کے حالات وواقعات کو بیان کیا ہے۔ کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں ان صوفیائے کرام کا تذکرہ ہے جو بیرون سے کشمیر آئے اور جن کی ابتداء سید بلبل شاہ سے ہوتی ہے۔ اس دور کے ممتاز صوفیائے کرام میں سید علی ہمدانی، سید جانباز ولی اور سید حسین سمنانی شامل ہیں۔ دوسرا دور ان صوفیائے کرام پر مشتمل ہے جن کی ابتداء شیخ نورالدین ولی رشی سے ہوتی ہے۔ مصنف کے مطابق:

ڈاکٹر سید یوسف بخاری نے رشی سلسلے کے ۱۸۰ بزرگوں کے حالات وواقعات کا ذکر کیا ہے۔ تیسرے دور میں ان صوفیائے کرام کا ذکر ہے جن کا تعلق کشمیر ہی سے تھا لیکن انھوں نے رشیوں کی طرح دنیا ترک نہیں کی بلکہ دین اور دنیا دونوں کو سنبھالا۔ اس دور کے جو صوفیائے کرام مشہور ہوئے ان میں شیخ بہاؤالدین گنج بخش، شیخ حمزہ مخدوم، شیخیعقوب صرفی اور بابا داؤد خاکی جیسے بزرگ شامل ہیں۔ مؤلف نے تیسرے سلسلے کے تقریباً ۴۰۰ صوفیائے کرام اور بزرگان دین کے مختصراً حالات وواقعات کو بیان کیا ہے۔ "حیات حضرت پیر شاہ غازی"، "حیات حضرت کملا بادشاہ"، "حیات حضرت جنید شاہ"، "حیات حضرت غازی قلندر"، "حیات حضرت سائیں علی بہادر"، "حیات حضرت محمد علی / مائی طوطی صاحبہ"، "حیاتحضرت شاہ عنایت ولی" اور "حیاتحضرت سہیلی سرکار" کے مرتب سید محمود آزاد ہیں۔

چنانچہ اوپر بیان کردہ تمام سوانحی تصانیف جو **مجلسِ تحقیق وتصنیف** کے زیر اہتمام تحریر کی گئیں، زیادہ تر مختصر کتابچوں کی صورت میں منظرِ عام پر آئیں۔ اسی نوع کی بعض سوانحی تحریریں **محکمہ اوقاف** کے زیر اہتمام شائع ہونے والے سہ ماہی مجلے انوار الاولیاء میں بھی قلم بند کی گئیں۔ تاہم اگر فنی معیار کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو یہ تمام کتابچے اور تحریریں سوانح نگاری کے مروجہ اصولوں اور اسلوبیاتی لوازمات پر پوری طرح پورا نہیں اترتیں۔ اس کے باوجود ان میں سے ہر ایک میں متعلقہ شخصیت کے حالاتِ زندگی، دینی وعلمی خدمات، اور فکری وروحانی اثرات کے بارے میں کم وبیش کچھ نہ کچھ بنیادی معلومات ضرور فراہم ہو جاتی ہیں۔ آزاد

کشمیر میں صوفیائے کرام اور علمائے دین کی سوانح نگاری کی روایت کا تنقیدی مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اہلِ قلم حضرات نے ہمیشہ علما و صوفیا سے والہانہ عقیدت اور گہری وابستگی کا ثبوت دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی حیات و خدمات پر مختلف سطحوں پر مسلسل لکھا گیا ہے۔ ان تحریروں میں اگرچہ تحقیقی باریک بینی اور سوانحی اسلوب کی مکمل پاسداری نہیں ملتی، لیکن یہ تصانیف اس خطے کی فکری و روحانی تاریخ کا ایک قیمتی سرمایہ ضرور ہیں۔

ان سوانحی تصانیف کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آزاد کشمیر کے بیشتر صوفیائے کرام، بزرگ علما اور مشائخ عظام کے بارے میں کسی نہ کسی حد تک مواد موجود ہے۔ اگرچہ یہ مواد بعض اوقات محض تعریفی یا عقیدت مندانہ پیرایہ بیان میں ہے اور تحقیقی و تنقیدی اسلوب سے عاری ہے، لیکن اس کی تاریخی و علمی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ مستقبل کے محققین، ناقدین اور سوانح نگار ان کتابچوں اور مقالات سے بنیادی مآخذ کے طور پر رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ مزید برآں، یہ ابتدائی کوششیں آئندہ آنے والے سوانح نگاروں کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ اگر نئے اہلِ قلم تحقیقی معیار، ماخذات کی تنقید، اور سوانحی فن کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان شخصیات پر مزید کام کریں تو آزاد کشمیر میں سوانح نگاری کی روایت نہ صرف مستحکم ہو گی بلکہ ایک علمی، تحقیقی اور تنقیدی روایت کی شکل بھی اختیار کر لے گی۔ یوں یہ کتابچے اور مختصر تصانیف محض عقیدت کا اظہار نہیں رہیں گے بلکہ آئندہ علمی ذخیرے کے لیے سنگِ میل کی حیثیت اختیار کر سکیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ محمود آزاد، سید، تاریخ کشمیر، سیادت پبلیکیشنز، مظفر آباد، ۱۹۹۰ء، ص:۱۸۵

۲۔ بشیر احمد قاضی، حیات امیر شریعت (مولانا عبد اللہ کفل گڑھوی) مطبوعہ دائرہ معارف کراچی، س۔ن، ص:۲۴۸

۳۔ مولانا عبد الہادی، تاثرات مشمولہ، حیات امیر شریعت، مصنف قاضی بشیر احمد، دائرہ معارف کراچی، س۔ن، ص:۲۷۷

۴۔ مولانا سید مظفر حسین ندوی، پیش لفظ مشمولہ فیض الغنی، مصنف پروفیسر محمد یعقوب شائق، سدا بہار پبلشرز لاہور ۲۰۰۱ء، ص:۱۸۔۱۹

۵۔ پروفیسر یعقوب شائق، فیض الغنی، سدا بہار پبلشرز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص:۱۲۲

۶۔ پروفیسر یعقوب شائق، فیض الغنی، ص:۱۲۳

۷۔ پروفیسر یعقوب شائق، فیض الغنی، ص:۱۴۹

۸۔ مرد درویش، مؤلف مولانا سید عطاء اللہ شاہ، شرکت پرنٹنگ پریس لاہور، ۲۰۰۵ء، ص:۲۹۷

۹۔ مولانا زاہد الراشدی، تاثرات مشمولہ "مردِ درویش" مؤلد مولانا سید عطا اللہ شاہ، شرکت پرنٹنگ پریس لاہور، ۲۰۰۵ء، ص:۱۳۸

۱۰۔ ڈاکٹر محمد ریاض، حضرت میر سید علی ہمدانی، سنگ میل پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور، ۱۹۷۵ء، ص:۳۴